سچا اُمتی کون؟

ربیع الاول وہ مہینہ ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔ اسی نسبت سے اس ماہ میں کثرت کے ساتھ ایسی مجالس ومحافل منعقد کی جاتی ہیں جن میں پیغمبر اسلام ﷺ کی تعریف وتوصیف کے علاوہ سیرت النبی ﷺ کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔نعت خوانی ہوتی ہے اور آپ ﷺ کی خدمت میں محبت اور عقیدت کے اظہار کے لئے سلام پڑھے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ کھانا پکاتے ہیں اور گلی محلے کے ہمسایوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان ایام میں آپ کی ولادت کی خوشی منانے کے لئے کچھ دوسرے طریقے بھی اختیار کیے جاتے ہیں۔ان سارے کاموں سے ہم مسلمان ایک خوش فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ ہم نے نبی اکرم ﷺ کے اُمتی ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری ادا کرلی اور اتنا کچھ ہی کافی ہے۔ یہ جھوٹا اطمینان ہمیں یہ معلوم کرنے کی طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیتا کہ ہم غور کریں کہ حضور اکرم ﷺ سے محبت کے اصل تقاضے کیا ہیں اور آپ ﷺ کا سچا اُمتی بننے کے لئے قرآن حکیم میں ہمیں کن کن باتوں پر عمل کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔حق تو یہ ہے کہ سیرت النبی ﷺ کے عنوان سے منعقد ہونے والے اجتماعات اور جلسوں میں اس بات کو واضح کیا جانا چاہیے کہ آپ ﷺ کے ساتھ ہمارا عقیدت ومحبت کا جو گہرا رشتہ ہے اس کے عملی تقاضے کون کون سے ہیں اور پھر ہم سنجیدگی کے ساتھ ان تقاضوں کی ادائیگی پر کمربستہ ہوجائیں تاکہ اللہ کے ہاں ہمارا شمار آپ ﷺ کے سچے اُمتیوں میں ہوجائے۔ اگر یہ ارادہ لے کر ہم کسی سیرت کانفرنس میں شریک ہوں یا سیرت کی کوئی محفل منعقد کریں اور کوئی پختہ عہد کر کے وہاں سے اٹھیں تو یہ بات یقیناً فائدہ مند اور آنے والی حقیقی زندگی میں نفع بخش ہوگی۔

آیئے ہم اس موضوع پر روشنی ڈالنے کے لئے قرآن سے راہنمائی حاصل کریں جو اللہ تعالیٰ کا کلام اور سراسر حق وصداقت کی طرف گامزن کرنے والا ہے۔سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ کے آخری الفاظ اس طرح ہیں۔

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰۤئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

''پس جو لوگ ایمان لائے اُن (نبی اکرم ﷺ) پر اور جنہوں نے اُن ﷺ کی توقیر و تعظیم کی، اور جنہوں نے اُن ﷺ کی مدد اور حمایت کی (یعنی اُن ﷺ کے مشن میں اُن ﷺ کے دست و بازو بنے اور اُن ﷺ کے مقاصد کی تکمیل میں اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو کھپایا) اور جنہوں نے اُس نور کا اتباع کیا جو اُن ﷺ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، تو یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔''

اس آیت کے پہلے حصہ میں اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ یہی وہ "الرّسول النبیّ الأمّی" ہیں جن کی آمد کی خوشخبری پہلے انبیاء اکرام دیتے رہے ہیں اور یہ پیش گوئیاں تمہاری کتابوں توارات اور انجیل میں موجود ہیں۔ اب ہمارے وہ رسول تمہارے پاس آ گئے ہیں۔ یہ تمہیں بھلے کام کرنے کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ پاکیزہ چیزوں کو حلال اور گندی چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔اس کے علاوہ رسم ورواج کی جن پابندیوں کو تم نے مقدس سمجھ کر اختیار کررکھا ہے اُن کی بے سند حیثیت کو واضح کر کے تمہیں اُن سے نجات دلانے آئے ہیں تاکہ تمہارے لئے سہولت پیدا ہو اور خواہ مخواہ کے بوجھ تمہاری کمر سے اتر جائیں۔ پس جو لوگ اس (پیغمبر) پر ایمان لائیں اور اُس ﷺ کی عزت وتوقیر کریں اور اس کی حمایت اور مدد کریں اور اس نور (ہدایت) کی پیروی کریں جو اُس ﷺ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے (تو) وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اب آیت کے اوپر ذکر کیے گئے حصہ پر غور کریں تو آپ ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی چار بنیادیں سامنے آتی ہیں جن کو مضبوط کرنے سے ہی ہم آپ کے سچے امتی بن سکتے ہیں۔

1) آپ ﷺ پر ایمان لایا جائے اور تصدیق کی جائے۔

2) آپ ﷺ کی عزت وتوقیر کی جائے۔

3) آپ ﷺ کی نصرت وحمایت کی جائے۔

4) آپ ﷺ پر جو نور ہدایت یعنی قرآن مجید نازل کیا گیا ہے اُسکا اتباع اور پیروی کی جائے۔

اب ان چاروں بنیادوں کے متعلق علیحدہ علیحدہ کچھ تفصیلی ذکر کیا جاتا ہے تاکہ غور وفکر کے لئے مزید راہیں کھل سکیں۔

ا۔ایمان

سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی اولین بنیاد یہ ہے کہ ہم آپ ﷺ پر ایمان لائیں اور تصدیق کریں یعنی آپ کو اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا پیغام بر تسلیم کریں اور اس یقین کو دل کی گہرائیوں میں جگہ دیں۔اس کے ساتھ ہی ہمارے اور حضور ﷺ کے درمیان ایک رشتے اور تعلق کا آغاز ہوجاتا ہے۔امت مسلمہ میں چند سادات اور ہاشمیوں کو چھوڑ کر کسی کا بھی آپ ﷺ کے ساتھ نسل اور خون کا تعلق نہیں۔اس کے باوجود ہر امتی کو آپ ﷺ کے ساتھ ایک نسبت اور تعلق حاصل ہے اور یہی نسبت سب سے اہم اور سب سے مضبوط تعلق ہے۔اسی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے دل میں یہ بات صحیح طور پر بیٹھ جاتی ہے کہ آپ ﷺ جو کچھ بھی فرماتے ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہدایت کا پیغام ہوتا ہے۔آپ ﷺ تمام انسانوں کی طرف بشیر (خوشخبری سنانے والے) اور نذیر (خبر دار کرنے والے) بنا کر بھیجے گئے ہیں۔اسی بات کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا﴾ (سبا ۲۸)

''اور (اے نبی) ہم نے آپ ﷺ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کے لئے خوشخبری دینے والا اور خبردار کرنے والا (بنا کر)۔''

یہ حقیقت بھی ہر ایک کے علم میں ہے کہ ایمان کے دو درجے ہوتے ہیں ایک ''اقرار

باللّسان'' اور دوسرا ''تصدیق بالقلب''۔یعنی زبان سے اقرار کرنا اور دل سے اسے سچا ماننا۔یہ دونوں پہلو موجود ہوں گے تو یقین کامل ہوگا اور ایمان مکمل ہوگا۔کیونکہ صرف زبانی اقرار ہومگر دل میں یقین نہ ہوتو یہ منافقت ہے۔مدینہ کے منافقین زبان سے تو آپ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرتے تھے جیسا کہ سورۃ المنافقون کے آغاز میں ہے۔

﴿اِذَا جَآءَكَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا نَشۡهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوۡلُ اللّٰهِ﴾

''جب منافق آپ ﷺ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں بیشک آپ اللہ کے رسول ہیں۔''

پھر اقرار کے اظہار کے لئے آپ ﷺ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے۔رمضان کے روزے رکھتے تھے۔زکوٰۃ بھی ادا کرتے تھے لیکن ان کے دل نور ایمان سے خالی تھے لہٰذا یہ رویہ نفاق ٹھہرا جس کا نتیجہ جہنم ہے اور جہنم کا بھی سب سے نچلا حصہ۔جیسا کہ قرآن مجید میں ہے ﴿اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِى الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ یقیناً منافق تو آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اسی طرح اگر کوئی شخص آپ ﷺ کو دل کی گہرائیوں سے اللہ کا رسول مانتا ہومگر بولنے کی طاقت رکھنے کے باوجود زبان سے اس کا اقرار نہ کرے تو قانون شریعت کی رُو سے وہ شخص کافر قرار پائے گا۔پس دنیا میں وہی شخص مسلم سمجھا جائے گا جو زبان سے کلمہ شہادت کا اقرار کرے کہ "اَشۡهَدُ اَنۡ لَّآاِلٰهَ اِلا اللّٰه وَ اَشۡهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَ رَسُوۡلُه"اور آخرت میں وہی شخص مومن مانا جائیگا جو زبانی اقرار کیساتھ تصدیق بالقلب کی دولت سے بھی مالا مال ہو اور یہ یقین رکھتا ہو کہ محمد بن عبداللہ، اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں اور اُن ﷺ پر نازل ہونے والا کلام، قرآن مجید کی صورت میں ہمارے سامنے ہے جو کسی بھی قسم کی تحریف سے محفوظ ہے اور قیامت تک اسی طرح محفوظ رہے گا۔اب نہ کوئی نیا نبی آئے گا اور نہ کوئی نئی کتاب نازل ہوگی۔الغرض زبانی اقرار کیساتھ قلبی یقین بھی ضروری ہے اور ایمان کی تکمیل ان دونوں کے یکجا موجود ہونے سے ہی ہوگی۔

۲۔ توقیر و تعظیم

ایمان کی ان دونوں سطحوں پر موجودگی سے لازمی طور پر انسان کے عمل میں کچھ اثرات پیدا ہوں گے، جیسا کہ آگ کے جلا دینے کی تاثیر کو ہم یقینی سمجھتے ہیں تو آگ میں ہرگز ہاتھ نہیں ڈالتے۔ پس جب آپ ﷺ کی رسالت پر یقین قلبی حاصل ہو تو لازماً اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ ﷺ کو عام انسان نہیں سمجھا جائے گا اور پھر آپ کے ساتھ عام لوگوں کا سا رویہ بھی نہیں رکھا جائے گا۔ جیسا کہ خود قرآن مجید میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح نہ آواز دو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو آواز دیتے ہو۔ گویا رسالت کے پختہ اقرار کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کی عزت و تکریم کی جائے جیسا کہ زیرعنوان آیت میں ایمان بالرسالت کے بعد عَزَّرُوْهُ کے الفاظ ہیں یعنی اُن ﷺ کی عزت و تکریم کرو۔ کیونکہ وہ رب العالمین کے برگزیدہ بندے اور خالق کائنات کے بھیجے ہوئے ہیں جنہیں ہماری ہدایت و راہنمائی کے لئے بھیجا گیا ہے۔ انہوں نے ہمیں جو کچھ بتایا وہ اللہ تعالیٰ ہی کا پیغام ہے۔ اگر کسی کام کے کرنے کا حکم دیا ہے تو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جس کام سے رکنے کو کہا ہے تو وہ بھی حکم ربّ کے مطابق ہی کہا ہے۔ حلال و حرام کے سلسلہ میں انہوں نے جو احکام دیئے ہیں وہ بھی اپنی مرضی سے نہیں بتائے بلکہ ہر بات اللہ کی طرف سے پیش فرمائی ہے۔ جیسا کہ سورۃ النجم میں ارشاد ہوا ہے۔

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾

اور یہ پیغمبر اپنی خواہش نفس سے بات نہیں کرتے یہ تو صرف وحی ہوتی ہے جو اُن کی طرف بھیجی جاتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ایمان بالرّسالت کا فطری اور لازمی نتیجہ آپ ﷺ کی عزت و توقیر اور ادب واحترام ہے۔

اسی بات کو سورۃ الحجرات میں کھول کر بیان کر دیا گیا ہے کہ مسلمان رسول ﷺ کے ادب واحترام کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا

تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾

اے مومنو! نبی ﷺ کی آواز سے اپنی آوازیں بلند نہ کرو، اور ان کے سامنے اونچی آواز سے نہ بولو، جیسا کہ تم ایک دوسرے سے بلند آواز میں گفتگو کرتے ہو، کہیں تمہارے سارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

یہ اس لئے فرمایا کہ جب انسان یہ سمجھ رہا ہو کہ اُس نے کوئی نافرمانی تو کی نہیں بلکہ اطاعتِ رسول پر کاربند ہے تو اُسے اعمال ضائع ہو جانے کا احساس کیسے ہوگا۔ مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ نافرمانی اور معصیت تو دور کی بات ہے صرف ادب کے تقاضے کو پورا نہ کرنے پر اچھے بھلے اعمال کے ضائع ہو جانے کی وعید سنائی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصحاب رسول ﷺ میں سے ایک صاحب نے جب یہ آیت سنی تو آپ ﷺ کی مجلس میں بیٹھنا چھوڑ دیا جب پوچھا گیا تو کہنے لگے کہ میری آواز فطرتاً بلند ہے اس لئے محفل رسالت میں نہیں بیٹھ سکتا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے سارے اعمال ضائع ہو جائیں۔ پس سورۃ الحجرات کی اس آیت اور صحابہ اکرامؓ کے عمل سے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ ایمان بالرّسالت کا اولین نتیجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کا ادب واحترام ملحوظ رکھا جائے اور عزت و توقیر کی جائے۔

جب رسول اللہ ﷺ پر ایمان لا کر اُنکے ادب واحترام کو اختیار کرلیا جائے گا تو آپ ﷺ کی پیروی کرنے اور آپ ﷺ سے محبت رکھنے کے جذبات خود بخود پیدا ہو جائیں گے اور اس کا پیمانہ یہ ہوگا کہ جیسے ہی قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم سامنے آئے گا، تو پھر اپنی یا کسی اور کی بات کی کوئی قدر نہیں ہوگی اور آپ ﷺ ہی کے فرمان کو اختیار کیا جائے گا۔

اطاعت رسول ﷺ

جس ہستی کا ادب واحترام اور عظمت اس حد تک ذہن میں موجود ہو تو اُس کی اطاعت

پر تو دل ضرور مائل ہوگا۔ اسی لئے یہاں حدیث کے واضح الفاظ میں اس شخص کے ایمان کی نفی کردی گئی ہے جس کے ہاں فرمودات رسول ﷺ کی اطاعت نہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمر و ابن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

((لَا یُؤمِنُ اَحَدُکُم حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبُعًا لِّمَا جِئتُ بِہٖ))

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اُس کی خواہش نفس اس (ہدایت) کے تابع نہ ہوجائے جو میں لے کر آیا ہوں۔

اس حدیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد جب تک احکام شریعت، حلال وحرام اور اوامر ونواہی جو رسول اللہ نے قرآن وحدیث کے ذریعے پیش کئے ہیں کی پابندی خوش دلی کے ساتھ قبول نہیں کی جاتی تو کیسا ایمان اور کیسی عزت وتوقیر۔

رسول اللہ ﷺ کی کامل اطاعت اور قرآن وسنت کے احکام کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا ایمان بالرّسالت کی شرط لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے وہاں اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم بھی ساتھ ہی موجود ہے۔ بلکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ رسول ﷺ کی اطاعت ہی دراصل اللہ کی اطاعت ہے۔ دیکھئے سورۃ النساء آیت نمبر **80** ﴿مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ﴾ جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔ پھر سورۃ اٰل عمران آیت **32** ﴿قُلۡ اَطِیۡعُو اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ﴾ کہہ دیجئے اطاعت کرو اللہ کی اور رسول ﷺ کی اسی طرح سورۃ التغابن آیت **12** میں فرمایا گیا ﴿اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ﴾ یعنی اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔

یہاں ادنیٰ سا غور کرنے سے انسان اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ جس شخص نے آپ ﷺ کو اللہ کا رسول اور اُس کا نمائندہ مان لیا تو اب اُس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں کہ وہ آپ ﷺ کا ہر حکم دل و جان سے تسلیم کرے اور آپ کے ارشاد پر لبیک کہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو بھی رسول بنا کر بھیجتا تھا اُس کی اطاعت کا بھی حکم دیتا

تھا۔ دیکھئے سورۃ النساء **64** ﴿وَمَا اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰہِ﴾ ''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔'' کیونکہ اللہ تعالیٰ خود تو اپنے احکام لے کر ہمارے پاس نہیں آتا۔ وہ اپنے احکام ہم تک پہنچانے کے لئے انبیاء و رُسل کو واسطہ بناتا رہا ہے۔ اسی طرح اللہ کی اطاعت کا واحد ذریعہ بھی رسول کی اطاعت قرار پاتا ہے۔ اسی بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا۔ ((مَنۡ اَطَاعَنِی فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ وَمَنۡ عَصَانِی فَقَدۡ عَصَی اللّٰہَ)) جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ (بخاری ومسلم عن ابی ہریرہ)

سورۃ النجم کی آیت ۲،۳ میں، جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ بات واضح کردی گئی کہ آپ ﷺ اپنی خواہشِ نفس سے زبان نہیں کھولتے، بلکہ وہ تو اللہ کا ہی حکم ہوتا ہے۔ پس ایسے احکام کو ماننا لازمی قرار پاتا ہے۔

سورۃ النساء کی آیت **65** میں اس بات کو اور واضح کرکے بیان کردیا گیا:

﴿فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡکَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَھُمۡ ثُمَّ لَایَجِدُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِھِمۡ حَرَجاً مِّمَّا قَضَیۡتَ وَیُسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡماً﴾

بس نہیں۔ آپ ﷺ کے رب کی قسم۔ یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہوں گے جب تک اپنے جھگڑوں میں آپ ہی کو حکم (مُنصِف) نہ مانیں۔ پھر جو فیصلہ آپ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اسے پوری خوش دلی کے ساتھ قبول کرلیں۔

معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت بس رسمی انداز میں مطلوب نہیں بلکہ اپنے ہر جھگڑے اور اختلاف میں آپ ﷺ ہی کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر اس پر آپ کے فیصلے کو مارے باندھے نہیں؛ بلکہ پوری آمادگی اور خوش دلی کے ساتھ قبول کرنے کو ہی ایمان کی سلامتی کی علامت سمجھا گیا ہے۔ پس آپ ﷺ کی ذات کو صرف مرکز عقیدت سمجھ لینا ہی کافی نہیں

بلکہ آپ کو مرکز اطاعت تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اطاعت کلی کے بغیر ایمان کا اقرار تو صرف زبانی دعویٰ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول نہیں۔

محبت

رسول اللہ ﷺ کی محبت بھی ایمان بالرّسالت کا تقاضا ہے۔ جب آپ ﷺ کو اللہ کا پیغمبر مان لیا۔ آپ کی ہستی کو واجب الاطاعت سمجھ لیا۔ آپ ﷺ کے ادب و احترام کو تسلیم کر لیا تو اس کا لازمی نتیجہ محبت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی محبت مسلمان کا جزوِ ایمان ہے۔ بلکہ آپ ﷺ کے ساتھ ایسی محبت ہونی چاہئے جس پر دنیا کی ہر چیز قربان کی جاسکے۔ مسلم اور بخاری میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا——

((لَا یُؤمِنُ اَحَدُکُم حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَالِدِهٖ و وَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ))

''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے لئے اس کے باپ، اس کے بیٹے اور تمام انسانوں سے محبوب تر نہ ہو جاؤں۔''

یعنی اگر کسی مسلمان کے دل میں حضور ﷺ کی محبت اپنے تمام اعزّہ و اقارب اور تمام انسانوں سے بڑھ کر نہیں ہے تو گویا وہ ایمان حقیقی سے محروم ہے ایسے شخص کو وہ ایمان حاصل نہیں جس کی بنیاد پر عدالت خداوندی میں جزا و سزا کے فیصلے صادر ہوں گے۔

اس سلسلہ میں حضرت عمر فاروقؓ کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے اُنؓ سے پوچھا اے عمرؓ ''تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟'' یہ انداز گفتگو بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے اور عمر فاروقؓ کے درمیان کس قدر اپنائیت کا جذبہ موجود تھا کیونکہ اس طرح کا سوال اُسی ہستی سے ہوسکتا ہے جس کی محبت، قرب اور جان نثاری ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہو۔ بہرحال حضرت عمر فاروقؓ نے جواب میں عرض کیا۔ ''حضور

آپ ﷺ مجھے دنیا کے ہر انسان سے زیادہ محبوب ہیں۔'' حضور ﷺ نے پھر دریافت فرمایا ''اور خود اپنی جان سے بھی؟'' اس پر حضرت عمرؓ نے کچھ توقف کیا اور پھر عرض کیا ''ہاں اب'' یعنی اب میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ ﷺ مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز اور پیارے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک لمحے کے توقف میں آپ ﷺ نے سوچ سمجھ کر اپنا جائزہ لیا، دل میں جھانکا اور پھر جواب دیا۔ جبکہ آج کے نعت خواں حضرات کا انداز کچھ اور ہے۔ نعت کہتے وقت تو تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے مگر عملی پہلو میں صفر۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ حالانکہ خوشامد کے انداز کی تعریف تو ویسے بھی اخلاقی کمزوری شمار ہوتی ہے نہ کہ کوئی قابل تعریف شے۔ اصل چیز تو خلوص و اخلاص ہوتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی طرف سے یہ جواب سن کر آپ نے فرمایا عمرؓ اب تم مقامِ مطلوب تک پہنچ گئے ہو۔ یعنی اگر میں تمہیں ہر چیز، ہر انسان حتیٰ کہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو گیا ہوں، تو اب میرا اور تمہارا تعلق، وہ تعلق ہے جو ربُّ العزت کے ہاں مطلوب ہے۔

اِتّباع

جب کسی ہستی کے ساتھ قلبی لگاؤ، محبت اور پیار کا تعلق حقیقی بنیاد اور پوری آمادگی اور خوش دلی کے ساتھ قائم ہوجائے تو انسان اُس کے ہر حکم کی صرف اطاعت ہی نہیں کرتا بلکہ اُس کی ہر ادا اور ہر اشارے پر لبیک کہنے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ وہ ہر وقت محبوب کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھتا ہے۔ اُسے محبوب کی چال ڈھال، اٹھنے بیٹھنے کا انداز، خوراک اور لباس پہننے کی عادات پیاری لگتی ہیں۔ وہ اپنے محبوب کی اداؤں کو بھی اپنانے کی کوشش کرتا ہے خواہ اُسے ان چیزوں کے بارے میں کوئی حکم نہ بھی دیا جائے۔ محبت بھرے جذبات اور خوش دلی کے ساتھ محبوب کے حکم کو بجا لانا تو اطاعت ہے مگر اُس کے چشم و ابرو کے اشارے کو سمجھنا اور اُس کی اداؤں کی نقالی کرنا اطاعت سے ایک قدم آگے کا رویّہ ہے اور یہ اتباع کہلاتا ہے۔ چونکہ صحابہ اکرامؓ حضور ﷺ کے صحیح قدر شناس تھے اور انہیں آپ ﷺ کے ساتھ بے پناہ محبت تھی اس لئے اتباع رسول ﷺ کی انتہائی تابناک مثالیں صحابہ اکرامؓ کی سیرت میں ملتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھئے اتباع

رسول ﷺ میں بہت اونچے مقام پر تھے۔ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کیساتھ سفر میں تھے۔آپ ﷺ کا گزر ایک خاص درخت کے نیچے سے ہوا۔اب حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب بھی اُس راستے سے گزرتے تو اُس درخت کے نیچے سے ہوکر گزرتے کہ آپ ﷺ کو انہوں نے وہاں سے گزرتے دیکھا تھا۔ اسی طرح حجۃ الوداع کے سفر کے دوران راستے میں جہاں جہاں آپ ﷺ نے قیام کیا، آرام کیا یا رفع حاجت کے لئے گئے، بعدازاں مکے کے سفر کے دوران اُنہی مقامات پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے قیام کیا، آرام کیا اور رفع حاجت کے لئے گئے۔ظاہر ہے اس کے بارے میں آپ ﷺ کا حکم نہ تھا اور نہ ہی شریعت میں یہ عمل کرنا ضروری تھا۔ ہوسکتا ہے آج کل کا کوئی عقلیت پسند تو اس انداز کو خواہ مخواہ کا تکلّف یا شاید جنون سمجھے لیکن یہ محبت کا معاملہ ہے، جس میں محبوب کی پیروی اور نقالی سے زیادہ لذیذ شئے اور کوئی نہیں ہوتی۔ اسی طرح ایک صحابیؓ کا ذکر ملتا ہے کہ وہ کہیں دور دراز سے چل کر مدینہ تشریف لائے، آپ ﷺ سے ملاقات ہوئی، اتفاق سے اس وقت آپ کا گریبان کھلا تھا۔اُن صحابیؓ نے پھر زندگی بھر اپنے کرتے میں بٹن لگا کر گریبان بند نہیں کیا کیونکہ انہوں نے آپ ﷺ کو اسی انداز میں دیکھا تھا۔ یہاں بھی دیکھئے آپ ﷺ نے اُنہیں ایسا کرنے کا حکم تو نہ دیا تھا اور نہ ہی کوئی اشارہ دیا تھا۔لیکن یہ بات سچی محبت کا تقاضا ہے اور اسکی لذّت وہی شخص محسوس کرسکتا ہے جو اتّباعِ محبوب کی اس منزل پر ہو۔

سورۃ آل عمران کی آیت نمبر **31** میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴾

”اے نبی ﷺ فرمادیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو، اُس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تم سے محبت کرے گا۔ اور تمہاری خطاؤں کو معاف فرمادے گا۔ اور اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا اور بہت رحم فرمانے والا ہے۔

یہ آیت کریمہ ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے محبت کا لازمی تقاضا رسول اللہ ؐ

کا اِتّباع ہے۔اسی اِتّباع کے نتیجے میں ہم اللہ کی محبت میں پختہ تر ہوتے جائیں گے، پھر جس کو یہ مقام و مرتبہ نصیب ہوجائے وہ کتنا خوش بخت اور نصیبے والا ہوگا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے دوبارہ یاددہانی ہوجائے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی اولین اور اہم ترین بنیاد اُن کی رسالت پر ایمان لانا ہے جس کا زبان سے اظہار اور دل سے اقرار ضروری ہے۔ پھر اسی ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ آپ ﷺ کی تعظیم و تکریم کی جائے۔اس تعظیم و توقیر اور عزت و احترام کے ناگزیر لوازم ۔۔پُرخلوص اطاعت اور محبت قلبی ہے جو ہر دوسری چیز کی محبت پر غالب ہو۔ اگر انسان یہاں تک پہنچ گیا تو گویا اب پیغمبر کا ہر اشارہ اور ہر ادا اُس کے لئے محبوب ہوجائے گی اور یہی اتباع ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ سورۃ آل عمران کی اوپر درج کی گئی آیت میں اسی بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو رسول ﷺ کا اتباع اپنے اوپر لازم کرلو۔اس کے نتیجہ میں اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے قصور معاف فرمادے گا۔

انتباہ

یہاں یہ بات جان لینا بھی ضروری ہے کہ ایمان اور عزت و توقیر دونوں ہی ضروری ہیں۔ان میں سے ایک غائب ہو تو یہ ادھورا طرزِ عمل آخرت میں نجات کے لئے کافی نہ ہوگا۔ بلکہ اگر ایمان کا دعویٰ بھی ہے اور ساتھ مارے باندھے کی اطاعت بھی ہورہی ہے، یعنی اطاعت دلی آمادگی کے ساتھ نہیں بلکہ رسماً یا دکھاوے کی ہے تو یہ طرزِ عمل منافقین کے ساتھ ایک مشابہت رکھتا ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ کے دور کے منافقین بھی ایمان کے مدعی تھے بلکہ اطاعت بھی کرتے تھے مگر اُنکی اطاعت مجبوری کی تھی۔ ذرا غور کیجئے آج کے آزاد خیال مسلمان جو نہ صرف اطاعت رسول ﷺ سے گریزاں ہیں بلکہ آپ ﷺ کے احکام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ دین کی بنیادی تعلیمات مثلاً جنت، دوزخ، ملائکہ، نزول وحی کا انکار کرتے اور اسلام کے نظام زندگی کو ناقابل عمل **(Out Dated)** قرار دیتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں مسلمان ہی سمجھے جاتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ کے

زمانے میں ایسا ممکن نہ تھا کہ کوئی مسلمان اسلامی عقائد کے بارے میں اس طرح کی گفتگو کر سکیں بلکہ وہاں تو منافقین بھی ایسا نہ کر سکتے تھے، وہ فرائض دینی کی ادائیگی کا اہتمام کرتے، نمازیں پڑھتے۔ اور شعائرِ دین کا احترام بھی کرتے تھے۔ پھر وہ قسمیں کھا کھا کر اپنے سچا اور مخلص ہونے کی یقین دہانی کروانے کی کوششیں کرتے تھے۔ مگر یہ سارے جتن کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اُن کو منافق ہی کہا۔ کیونکہ نہ اُن کو قلبی یقین حاصل تھا اور نہ واقعی اور حقیقی محبت۔ دیکھئے سورۃ المنافقوں آیت نمبر **1**

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴾

''اے نبی ﷺ جب یہ منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ آپ ﷺ اس کے رسول ہیں، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بیشک یہ منافق (اپنے قول میں) جھوٹے ہیں۔''

یعنی اُن کے منہ سے نکلنے والے یہ الفاظ تو سچے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن نہ یہ دل سے آپ ﷺ کو رسول مان رہے ہیں اور نہ ہی ان کو آپ ﷺ کے ساتھ سچی محبت ہے اس لئے یہ جھوٹے ہیں، ان کے قول کا کوئی اعتبار نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر حقیقی ایمان اور خوش دلی اور محبت کے ساتھ آپ ﷺ کی اطاعت ہی آپ ﷺ کے ساتھ تعلق کی اولین بنیاد قرار پاتی ہے۔

اس کے برعکس اگر طرزِ عمل یہ ہو کہ آپ ﷺ کے ساتھ محبت کے محض دعوے ہوں لیکن نہ تو اطاعت ہو، نہ فرائض کی ادائیگی کا اہتمام اور نہ اَوامر ونواہی کی پرواہ تو یہ طرزِ عمل فسق و فجور، نافرمانی اور خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔ اس قسم کا دعویٰ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہ ہوگا۔ بلکہ اس قسم کا دعویٰ تو دنیا میں بھی تسلیم نہیں کیا جاتا کہ کسی کے ساتھ محبت تو جتائی جائے مگر اُس کا کہنا نہ مانا جائے۔ اُس بیٹے کو باپ کے ساتھ خاک محبت ہے جو باپ کی بات تو مانتا نہیں مگر خوشامدانہ تعریف

بہت کرتا ہے۔

جان لیجئے کہ عشقِ نبی ﷺ اور محبت رسول کے بلند بانگ دعوے، وجد آفریں نعتیں، لمبے چوڑے سلام، پُر جوش اور شاندار جلوس، پرتکلف محافلِ میلاد اور سیرت کے جلسے اگر اطاعت رسول اور پیرویٔ سنت سے خالی ہیں تو یہ سب کچھ محض ڈھونگ اور خود فریبی ہے۔ اس کا حقیقت سے کچھ تعلق نہیں۔ میزان میں یہ سب کچھ بے وزن ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس کی پرکاہ کے برابر وقعت نہیں۔ کیونکہ ہر کسی کو دھوکہ دیا جاسکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ دھوکہ کھانے سے پاک اور برتر ہے۔ بلکہ ہر دھوکے باز اس کی گرفت میں ہے۔

۳۔ نصرت رسول ﷺ

سورۃ الاعراف کی آیت **157** میں ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد ''وَنَصَرُوْهُ'' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے یعنی جن لوگوں نے آپ ﷺ کی مدد اور حمایت کی۔ یہاں ہمیں دیکھنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حمایت اور مدد کس کام میں مطلوب ہے، تو جان لیجئے کہ ہر رسول پر ایک بھاری ذمہ داری ہوتی ہے جسے اُس نے ادا کرنا ہوتا ہے یعنی بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانا، شرک کے اندھیروں میں گم لوگوں کو نورِ توحید سے آشنا کرنا۔ اعمال صالحہ اور مکارم الاخلاق کو رواج دینا۔ معاشرے سے ظلم و زیادتی کو ختم کر کے عدلِ اجتماعی کا نظام قائم کرنا اور لوگوں کو اس بات سے خبردار کرنا کہ ایک روز ''اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ'' کے حضور کھڑے ہو کر دنیا میں کئے ہوئے اعمال کی جواب دہی کرنا پڑے گی، جس کے نتیجہ میں یا تو جنت کی ابدی راحتیں ملیں گی یا جہنم کا سخت عذاب۔ پیغمبر کا فرضِ منصبی یہ بھی تقاضا کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو بتا دے کہ آخرت کے حساب کتاب کے وقت کوئی کسی کے کام نہ آئے گا بلکہ بڑے سے بڑا رشتہ و تعلق بھی ختم ہو جائے گا۔ ہر کسی کو انفرادی طور پر خدا کے حضور پیش ہو کر حساب دینا ہوگا۔ ﴿لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور ﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ﴾ جس روز کوئی کسی کے بارے میں اختیار نہ رکھے گا اور حاکمیت صرف اللہ کی ہوگی۔ اس روز

اس دنیا میں کی ہوئی اچھائی یا بُرائی کا ریکارڈ ہر شخص کے سامنے ہوگا اور اُس پر اُس کی کامیابی یا ناکامی کا اعلان کیا جائے گا۔

قرآن مجید میں روزِ آخرت کی منظرکشی بہت سے مقامات پر کی گئی ہے سورۃ النازعات کی آیات **35** تا **41** میں فرمایا گیا۔

﴿يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعٰىo وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰىo فَاَمَّا مَنْ طَغٰىo وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَاo فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰىo وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىo فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰىo﴾

جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی، تو جس کسی نے سرکشی کی ہوگی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی ہوگی تو دوزخ ہی اس کا ٹھکانہ ہوگی، اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو بُری خواہشات سے باز رکھا تو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگی۔

تبلیغ کا کٹھن کام

وہ کون سا سخت مشکل کام تھا جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر ڈالی جسکا ذکر سورۃ المزّمل میں ان الفاظ میں آیا ہے۔﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًاo﴾ یعنی ہم عنقریب آپ ﷺ پر ایک بھاری فرمان نازل کریں گے اور پھر اس کے چند دنوں کے بعد ہی بھاری ذمہ داری کا بوجھ آپ ﷺ کے کندھوں پر ڈال دیا گیا کہ ﴿يَآ يُّهَا الْمُدَّثِّرُo قُمْ فَاَنْذِرْo وَرَبَّكَ فَكَبِّرْo﴾ یعنی اے کپڑا اوڑھ کر لیٹنے والے! کھڑے ہوجاؤ اور خبردار کرو (نیند کے ماتوں کو ہوشیار کرو، انہیں ڈراؤ) اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرو۔ یہ تھی وہ بھاری ذمہ داری اور یہی تھا آپ ﷺ کا فرض منصبی ۔ آپ کو شرک کے اندھیروں کو دور کرکے نورِ توحید

پھیلانا تھا۔ باطل کے ساتھ پنجہ آزمائی کرکے اُسے نیچا دکھانا اور حق کا بول بالا کرنا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے دین، یعنی دینِ حق کو تمام نظامِ زندگی پر غالب و نافذ کرنا تھا۔

سورۃ المدّثر کی تیسری آیت میں آپ ﷺ کو تکبیرِ ربّ کا حکم دیا گیا۔ لیکن اس سے مراد صرف زبان سے اللہ اکبر کہنا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کو دنیا والوں سے تسلیم کروانا اور فی الواقع وہ نظام برپا کرنا ہے جس میں حاکمیتِ اعلیٰ (**Sovereignty**) فقط اللہ تعالیٰ کے لئے مانی جائے۔ اُسی کا فیصلہ حرفِ آخر قرار پائے۔ اسی بات کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان الفاظ میں ادا کیا ”جس طرح اسؔ کی مرضی، آسمانوں میں پوری ہوتی ہے اسی طرح زمین پر بھی پوری ہو۔“ گویا قرآن مجید کے الفاظ میں ﴿وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا﴾ ”اور اللہ کی بات ہی غالب اور سربلند ہے“ کا عملی ظہور ہوجائے۔

مگر انسان نے کیا کیا۔ دنیا کی چمک دمک اور فریبِ شیطانی سے متاثر ہوکر دور اندیشی سے کام نہ لیا اور خواہش نفسانی کی پیروی میں خدا فراموشی کا مرتکب ہوگیا۔ اب پیغمبر کو یہ فرض سونپا گیا کہ وہ لوگوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرے۔ حق کی طرف دعوت دے اور باطل طریقوں پر چلنے کے خطرات سے آگاہ کرے۔ یعنی بندوں کو مالک سے متعارف کرائے اور اس حد تک جدوجہد کرے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بڑائی واقعی دنیا میں مانی جائے اور دینِ حق ثابت و قائم ہوجائے۔ پس تکبیرِ ربّ کا حقیقی مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ کی زمین پر اُس کا قانون نافذ ہو اُسی کے احکام اور اوامر پر عمل ہو یوں اللہ تعالیٰ کو عملاً مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کرلیا جائے۔

ان خطوط پر غور کیا جائے تو صاف طور پر واضح ہوجاتا ہے کہ آپ ﷺ کا فرض منصبی دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ دینِ حق کو غالب کرنا اور باطل نظریات کو مٹانا تھا۔ اسی بات کو قرآن مجید کی تین سورتوں (سورۃ التوبہ **33**، سورۃ الفتح **28**، سورۃ الصّف **9**) میں وضاحت کے ساتھ بیان کردیا گیا ہے۔ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ یعنی وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق (نظامِ اسلام) دے کر تاکہ وہ اس (ہدایت اور دینِ حق) کو پورے

کے پورے دین (نظام حیات) پر غالب کر دے۔

چونکہ اب قیامت تک کوئی اور نبی یا رسول آنے والا نہیں ہے لہٰذا خالق کائنات نے انسانوں پر حجّت پوری کرنے کے لئے آخری کتاب، مکمل ہدایت نامے کی صورت میں بھیج کر اُس کی حفاظت کا ذمہ بھی خود لے لیا تا کہ خدائی تعلیمات اپنے اصل الفاظ میں ہر طالب حق کے لئے قیامت تک محفوظ رہیں۔

جس وقت آپ ﷺ پر دعوت وتبلیغ اور دین حق کے غالب کرنے کی ذمہ داری ڈالی گئی اُس وقت پورے عالم انسانیت میں اس دعوت کے علمبردار صرف آپ ہی تھے۔ پورا ماحول جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ظلم وستم کا دور دورہ اور اخلاقیات کا جنازہ نکلا ہوا تھا۔ ان حالات میں دنیا کے بت کدہ میں توحید کی آواز بلند کرنا، نعرہ تکبیر بلند کرنا یعنی خدا کی کبریائی کو عملاً نافذ کرنے کی جدوجہد کا آغاز، غلبہ دین کی سعی...... امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نفاذ، مکارم اخلاق کی ترویج کا علم بردار بن کر اٹھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ کیونکہ تکبیر رب کی خاطر کھڑے ہونے کا مطلب پورے معاشرے سے اعلان جنگ کرنا تھا۔ جس کا حکم آپ ﷺ کو دیا گیا۔ ﴿قُمۡ فَاَنۡذِرۡo وَرَبَّكَ فَكَبِّرۡ﴾ یعنی کھڑے ہوجاؤ پس (بنی نوع انسان کو) خبردار کرو! اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو! پھر یہ بھی فرمایا گیا کہ آپ ﷺ اس کام کو انجام دیتے رہیں خواہ کافروں اور مشرکوں کو کتنا ہی بُرا معلوم ہو۔ ظاہر ہے کہ نفاذ حق کے لئے انقلابی انداز کی جدوجہد جن لوگوں کے مفاد کے خلاف جائے گی وہ تو ظلم وستم روا رکھیں گے۔ مصیبتوں کے پہاڑ توڑیں گے۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ اعلانِ نبوت سے پہلے جو لوگ آپ ﷺ کو صادق اور امین کہتے تھے وہی آپ کے شدید ترین دشمن بن گئے۔ مگر آپ ﷺ تھے کہ استقامت کا پہاڑ بن کر حالات کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انہی حالات میں آپ ﷺ کو ایک ایک کر کے ساتھی ملنے لگے اور آپ بالکل یکہ وتنہا نہ رہے بلکہ اب ایک چھوٹی سی جماعت آپ ﷺ کے ساتھ ہوگئی۔ یہ جماعت آپ ﷺ کے سچے اُمتیوں کی تھی۔ یہ لوگ فرض منصبی کی ادائیگی میں حضور ﷺ کے مدومعاون بنے۔ اس راستے میں اُن پر جو مشکلات آئیں اور ظلم ڈھائے گئے یہ ایک لمبی داستان ہے۔ یہاں تک کہ

انہیں مکہ سے نکل جانے پر مجبور کیا گیا۔ پس حق کی بالادستی کیلئے پیغمبر کا دست وبازو بننا، اسی کا نام نصرتِ رسول ہے اور اسی کا حکم قرآن مجید میں ﴿وَنَصَرُوۡهُ﴾ کے الفاظ میں ہے۔

حضور ﷺ کے اُمتی کی اہم ترین ذمہ داری

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ اصحاب رسولؐ فریضہ رسالت کی ادائیگی میں آپ ﷺ کے دست وبازو بنے۔ ہر طرح کی تکالیف برداشت کیں۔ مگر آپ ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ بلکہ جان نثاری کی وہ مثالیں قائم کیں کہ زمانہ اُن کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جہاں حضور ﷺ کا پسینہ گرتا تھا وہاں وہ اپنا خون گرانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ دعوت وتبلیغ کے کام میں وہ آپ ﷺ کے ساتھ ہوتے تھے۔ معرکہ کارزار (جنگ) میں آپ ﷺ پر جان نچھاور کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے فرامین سرآنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ وہ تھے آپ ﷺ کے حقیقی اُمتّی اور آپ کے دست وبازو۔

چونکہ حضور ﷺ اللہ کی طرف سے آخری نبی اور رسول بنا کر بھیجے گئے تھے، لہٰذا آپ کی رسالت ہی قیامت تک جاری وساری ہے اور یہی قرآن انسانوں کے لئے ضابطہ حیات کے طور پر رہے گا۔ چنانچہ آج مسلمانوں کی وہی ذمہ داری ہے جو آپ کے صحابہ کرام کی تھی اور وہ ہے نصرت رسول ﷺ۔ یعنی آپ ﷺ کے مشن کو آگے بڑھانا، اس کا انداز یہی ہے کہ اپنی بہترین صلاحیتوں کو اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس راہ میں مال خرچ کیا جائے، اوقات کو اقامت دین کی سربلندی میں لگایا جائے۔ ظاہر ہے یہ کام تو کرنے کے ہیں۔ زبانی دعوؤں کا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مسلمان کا وجود گواہی دے رہا ہو کہ ﴿اِنَّ صَلَاتِی وَ نُسُکِی وَ مَحۡیَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ یعنی میری نماز، میری عبادات اور میری زندگی اور میری موت، اللہ کے لئے ہے جو پروردگار ہے تمام جہانوں کا۔

نصرتِ رسول کے لفظ سے کسی کو خیال آسکتا ہے کہ اللہ کے نبی اور رسول ﷺ کو کسی انسان کی مدد کی کیا ضرورت ہے؟ نبی کا مقام ومرتبہ تو یہ ہے کہ اللہ خود اُن کا مولا اور مددگار ہے۔

پھر اللہ کے فرشتے اُن کے پشت پناہ ہیں۔علاوہ ازیں روح القدس (حضرت جبرائیل) کی تائید اُن کو حاصل ہوتی ہے۔ پھر انہیں اہل ایمان کی نصرت کی کیا حاجت۔تو جان لیجئے کہ عالم اسباب میں دین حق کے غلبہ کی جدوجہد انسانوں ہی کو کرنی ہے جن کو زمین میں اللہ کا خلیفہ قرار دیا گیا ہے۔انسانوں کی راہنمائی کے لئے اور انہیں بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ انبیاء و رُسل کو بھیجتا رہا ہے، تاہم اقامت دین، شہادت حق اور دعوت وتبلیغ کی جدوجہد انسانوں ہی کو کرنی ہوتی ہے۔ نبی اس دعوت وتبلیغ کا داعی اوّل ہوتا ہے اور وہی سب سے پہلے اس علم کو لے کر کھڑا ہوتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ اس کام میں داعی اول تھے۔

جیسا کہ سورۃ الاحزاب (آیات 45،46) میں فرمایا گیا۔

﴿ یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیۡرًاo وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذۡنِہٖ وَسِرَاجاً مُّنِیۡرًاo﴾

’’اے نبی ﷺ ہم نے آپ کو گواہی دینے والا، بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا‘ اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔‘‘

امتحان و آزمائش

نبی ﷺ کی پکار کو قبول کر کے جو لوگ اُس کے ساتھی بن جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کی آزمائش کرتا ہے، کیونکہ اس عالم اسباب میں دین کا پھیلانا اس کی دعوت کا عام ہونا، اللہ اور اس کے رسول اور آخرت پر ایمان رکھنے والے لوگوں کی جدوجہد، ایثار وقربانی اور جذبہ صادقہ کے ذریعہ ہی ممکن ہوگا۔تشریعی طور پر اللہ کی بڑائی توفی الواقع ان لوگوں کی محنت اور کوشش اور پھر جہاد وقتال ہی کے ذریعہ ہوگی۔اس مشن میں نبی کے ساتھی جب پورے خلوص واخلاص کے ساتھ نکلیں گے تو اللہ کی تائید ونصرت کے ساتھ دین غالب ہوگا۔ یہی سنت اللہ ہے۔اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اُس کے دین کی سربلندی کے لئے دشمنانِ خدا ورسول کے بالمقابل سیسہ پلائی

ہوئی دیوار بن جائیں۔سورۃ الصّف آیت 4 میں ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌo﴾

یقیناً اللہ اُن کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صفیں باندھ کر جنگ کرتے ہیں گویا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔

اس جدوجہد اور کشاکش میں مومنین صادقین کی آزمائش ہے اور اسی آزمائش کے نتیجہ میں کھوٹے اور کھرے کی پہچان ہوجاتی ہے۔ آپ ﷺ کے مشن میں آپ ﷺ کا ساتھ دیتے ہوئے تن من دھن کھپانے کو اللہ تعالیٰ نصرت رسول ﷺ کہتا ہے۔سورۃ العنکبوت آیت 11 میں فرمایا:

﴿وَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَیَعۡلَمَنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَo﴾

اور اللہ ظاہر کردے گا ان کو بھی جو (واقعتاً) ایمان لائے ہیں اور انکو بھی جو منافق ہیں۔

یہ امتحان اور آزمائش دنیا کی زندگی میں ضروری ہے کیونکہ دنیا دارالعمل ہے۔انعام کا مستحق بننے کے لئے خلوص کے ساتھ جدوجہد ضروری ہے۔ جب کہ نرا دعویٰ کرنے والے ان آزمائشوں میں پورے نہیں اترتے۔ بہرحال نصرت رسول منصب رسالت کی تکمیل میں جان و مال صرف کرنا اور دعوت وتبلیغ کے کام میں صبر واستقامت اور پرخلوص جذبے کے ساتھ لگے رہنے کا نام ہے۔اگر یہ نہیں تو رسول ﷺ پر ایمان کا اعلان اور محبت کا دعویٰ باطل ٹھہرے گا جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مسترد کردیا جائے گا۔

اپنا جائزہ خود لینے کی ضرورت!

ہجرت کے تیسرے سال غزوہ اُحد پیش آیا جس میں خود حضور ﷺ بھی اپنے جاں نثار

صحابہ کے ساتھ مشرکین کے سامنے سینہ سپر تھے۔ کفر و اسلام کے اس خونی معرکے میں خود رحمت اللعالمین بھی زخمی ہوئے۔ دندان مبارک شہید ہوئے اور مقدس خون بھی راہ حق میں بہا....اور فرض کیجئے کہ عین اس وقت اگر کوئی عشق رسول ﷺ کا دعوے دار مدینہ کے اندر مسجد میں بیٹھا درود وسلام کا وِرد کررہا ہوتا، کیف و وجدان میں نعتیں پڑھ رہا ہوتا تو یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہوتی۔ کیونکہ یہ طرز عمل ایمان بالرّسالت اور محبت رسول ﷺ کے ساتھ کوئی نسبت نہ رکھتا۔ اب ذرا اپنے حالات کا جائزہ لیجئے۔ آج کی صورت حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ پوری دنیا پر طاغوتی طاقتیں چھائی ہوئی ہیں۔ اسلامی شعائر اور تعلیمات کا مذاق اڑایا جارہا ہے۔ ضرورت اس اَمر کی ہے کہ اسلام کی سربلندی کے لئے ہر ممکن سعی کی جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا مشن مردہ نہیں ہوا بلکہ زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا۔ دین کو سربلند کرنے کا فریضہ اب امّت کے ذمہ ہے۔ اس وقت اگر کوئی شخص حضور ﷺ کے عشق کا دعویٰ کرتا ہے اور اس کے اظہار کے لئے درود وسلام اور زبانی کلامی عقیدت کے پھول بکھیرتا پھرتا ہے مگر اسلامی اقدار کی پامالی اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر اُسے کوئی تشویش نہیں ہوتی اور فواحش ومنکرات کے فروغ پر اس کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں آتا تو یہ کیسی محبت اور کیسا عشق ہے۔

حضور ﷺ کی رسالت تا قیامِ قیامت ہے۔ اب کوئی نیا نبی نہیں آئے گا۔ حضور ﷺ کا مشن جاری وساری ہے۔ حضور کے مقصد بعثت کی تکمیل اب افراد امّت کے ذمہ ہے۔ یعنی اللہ کے دین کو عملاً غالب اور قائم کرنا۔ یہ مشن اُس وقت تک جاری رہے گا جب تک اس پورے کرہ ارضی پر اللہ کا دین غالب نہیں ہوجاتا۔ اس کام میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی عمر کے 23 سال صرف کئے اور نتیجہ کے طور پر جزیرہ نمائے عرب کی حد تک نظام باطل کا قلع قمع کر کے حق کا بول بالا کردیا۔ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں دین اسلام کی سربلندی کا یہ فریضہ آپ ﷺ نے امت کے سپرد کیا تھا۔ چنانچہ اب یہ امت مسلمہ کا فرض ہے کہ دین کی سربلندی کے لئے ہمہ تن مصروف ہو اور مقصد رسالت کی تکمیل کے لئے کوشاں رہے۔ ؎

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے

نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

اب ہر مدعی ایمان، عاشق رسول اور محبّ رسول ﷺ کو اچھی طرح اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ وہ کس مقام پر کھڑا ہے۔ اگر اُسے آنحضرت ﷺ کے مقصد بعثت اور آپ ﷺ کے مشن سے کوئی دلچسپی نہیں تو اُسے خود سمجھ لینا چاہئے کہ اُس کے دعویٰ میں کس قدر صداقت ہے جب کہ آج کی صورت حال ہر ایک کے سامنے ہے۔ بقول حالی مرحوم ؎

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

مستقبل کے بارے میں حضور ﷺ کی تلقین

صادق المصدوق، النّبی الامّی ﷺ نے ہمیں پہلے سے خبردار کردیا تھا۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((بَدَأَ الِاسْلَامُ غَرِیباً و سَیَعُودُ کَمَا بَدَأَ فَطُوبٰی لِلغُرَبَاءِ))

''اسلام کی ابتداء اجنبیت کی حالت میں ہوئی تھی اور یہ اسی حالت میں پھر لوٹ آئے گا۔ تو بشارت ہے ''غربا'' کے لئے۔''

یہ ''غربا'' کون ہیں۔ عربی زبان میں غریب کے معنی اجنبی کے ہیں۔ اسی طرح ''غریب الوطن'' مسافر کو بھی کہا جاتا ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا آغاز اجنبیت سے ہوا۔ یعنی مسلمانوں کو کوئی پوچھتا تک نہ تھا اسلام اجنبی اور تنہا تھا۔ (بعد میں اسلام کو شان وشوکت ملی مگر) پھر دوبارہ ایسا زمانہ آئے گا کہ وہ پھر اجنبی ہوجائے گا۔ یعنی کفّار، ملحدین اور بدعات کو فروغ دینے والوں کی کثرت ہوگی اگرچہ نام کے مسلمان کثیر تعداد میں ہوں گے مگر سچے، مخلص اور متقی افراد کم سے کم ہوتے چلے جائیں گے تو اس حدیث میں ان قلیل یعنی غرباء کے لئے جنت کی

بشارت ہے۔

مسند احمدؒ کی ایک روایت میں آپ ﷺ نے خود غرباء کا مطلب واضح کر دیا۔ آپ نے فرمایا ((الْغُرَبَاءُ الَّذِیْنَ یُحْیُوْنَ سُنَّتِی وَیُعَلِّمُوْنَهَا النَّاسَ)) "غرباء" وہ ہیں جو میری سنت کو زندہ کریں گے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں گے۔ اب ہر مسلمان اپنا جائزہ بڑی آسانی سے لے سکتا ہے کہ اس دور میں وہ بھی ''غرباء'' میں شامل ہے یا نہیں۔ اگر وہ غرباء میں شامل ہے تو اُس کی خوش بختی کا کیا کہنا۔

آپ ﷺ کی ایک اور پیشینگوئی اس طرح سے ہے ((لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ)) اسلام میں اس کے نام کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں اس کے حروف کے سوا کچھ باقی نہ بچے گا۔ اس حدیث پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ آج کے دور پر یہ کس طرح صادق نظر آتی ہے۔ آج روئے زمین پر کہیں بھی اسلام فی الواقع قائم نہیں۔ خود مسلمانوں کا کردار اسلامی تعلیمات سے دور ہے۔ قران کی حیثیت محض ایک مقدس کتاب کی رہ گئی ہے جسے حصول ثواب و ایصال ثواب کے لئے پڑھا جاتا ہے۔ قرآن سے مسلمانوں کی اجنبیت اس حد تک ظاہر ہو رہی ہے کہ وہ قرآنی فیصلوں کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ (الا ماشاءاللہ)

''آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہ صورت حال عملاً پیدا ہو چکی ہے جس کی خبر ان احادیث مبارکہ میں دی گئی ہے۔ اس صورت حال میں ہم میں سے ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنا جائزہ لے کر فیصلہ کرے کہ اگر اُسے حضور ﷺ سے محبت ہے، اگر اُسے حضور ﷺ سے کوئی مخلصانہ تعلق ہے، اگر وہ سمجھتا کہ حضور ﷺ کے ساتھ اس کا رشتہ صحیح بنیادوں پر قائم ہے تو کیا اس کی زندگی کا مقصد اور نصب العین بھی وہی ہے یا نہیں جو محمد صلی اللہ علیہ کا مقصد بعثت تھا؟ یعنی اللہ کے کلمے کی سربلندی، پورے نظام پر دین حق کا نفاذ اور اللہ کی بڑائی کو بالفعل قائم و نافذ کرنا۔

اتباع کا تقاضا

''نصرتِ رسول ﷺ'' کی مزید وضاحت ''اتباع رسول'' کے حوالہ سے بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، اتباع کے معنی ہیں حضور کے نقش قدم پر چلنا اور حضور ﷺ کے ہر عمل کی پیروی کرنا۔ اب ہمیں غور کرنا چاہئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں جو عمل تواتر کے ساتھ ہوا ہے، پیہم و مسلسل ہوا ہے۔ جو پورے تیئیس برس تک شب و روز ہوا ہے، جس میں ایک لمحہ اور ایک گھڑی کا وقفہ نہیں، وہ عمل کیا ہے؟ نماز کے بارے میں پوچھا جاسکتا ہے کہ کب فرض ہوئی؟ رکعتوں کا تعین کب ہوا؟ کب دو تھیں کب چار ہوئیں؟ روزوں کی فرضیت کب ہوئی؟ زکوٰۃ کا نظام کب قائم ہوا اور مقدارِ نصاب کب متعین ہوا؟ شراب و قمار کب حرام ہوئے؟ سود کی حرمت کا حکم کب نازل ہوا۔ ان سب کے لئے احادیث اور سیرت سے اوقات اور زمانے کا تعین کیا جاسکتا ہے، جس میں اختلاف بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن ایک بات متفق علیہ ہے جس میں کسی اختلاف اور قیل و قال کی گنجائش نہیں اور وہ بات یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اول یوم بعثت سے لے کر اس حیات دنیوی کے آخری سانس تک جو عمل پیہم، مسلسل اور متواتر شب و روز کیا ہے، جلوت و خلوت میں کیا ہے، وہ دعوت و تبلیغ کا عمل ہے، وہ تکبر رب کی سعی و جہد ہے۔ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جہاد ہے۔ وہ دین حق کو سربلند کرنے کی تگ و دو ہے، وہ غلبہ و اقامتِ دین کے لئے مجاہدہ و تصادم ہے۔ اس مجاہدہ و جہاد کی شکلیں بدلی ہیں، صورتوں میں تبدیلی آئی ہے، بتدریج مختلف مراحل آئے ہیں۔ کہیں مکی دور میں یہ جدوجہد دعوت و تبلیغ اور شدائد و مصائب کے برداشت کرنے کے درجہ میں تھی، جس میں آپ ﷺ کو طائف کے گلی کوچوں میں پتھر بھی کھانے پڑے۔ کہیں وہ مدنی دور میں باطل کے ساتھ مسلح تصادم کے نتیجے میں بدر و اُحد اور احزاب و تبوک کے معرکوں کی صورت میں نظر آتی ہے، کہیں قبائل عرب اور قرب و جوار کے سلاطین کو وفود و خطوط کے ذریعہ دعوت دینے کے مراحل میں تھی، کہیں صلح حدیبیہ، فتح مکہ اور غزوہ حنین کی صورت میں جاری و ساری تھی۔ لیکن آپ ﷺ کا جو عمل تیئیس سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے، ہر لمحہ ہر گھڑی اور ہر آن انجام دیا جارہا ہے، وہ ہے عملِ دعوت و تبلیغ۔ اب جو شخص بھی متبعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ہونے کا مدعی ہو، جو یہ سمجھتا ہو کہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا التزام ضروری ہے، اس کے بارے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کی زندگی میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی، سب سے زیادہ متواتر متفق علیہ اور ثابت شدہ سنت کس حال میں ہے؟ اس کے اندر دعوت وتبلیغ کی کتنی تڑپ اور کتنی لگن ہے؟ اور وہ اس کام میں کتنا وقت خرچ کر رہا ہے اور کتنا مال لگا رہا ہے؟

رسول ﷺ کی نصرت ـــ اللہ کی نصرت ہے:

رسول ﷺ کے مشن میں آپ ﷺ کا ساتھ دینا نصرت رسول ہے اور یہ نصرت رسول ﷺ درحقیقت اللہ کی نصرت ہے۔ یوں اس عمل کی عظمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ سورۃ الصّف کی آخری آیت میں ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اپنے حواریوں سے دریافت فرمایا۔ ﴿مَنْ اَنْصَارِیٓ اِلَی اللّٰہِ﴾ یعنی اللہ کے راستے میں میرا مددگار کون ہے‘ تو حواریوں کا جواب اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں نقل کرتا ہے ﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہ﴾ یعنی ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ اللہ تو کسی قسم کی مدد کا محتاج نہیں۔ وہ تو کُنْ فَیَکُوْن کے اختیار کا مالک ہے۔ پھر اُس کی مدد کیسی؟ تو جان لیجئے! جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے، اس عالم اسباب میں جو بھی جدوجہد ہوگی وہ انسانوں ہی کو کرنا ہے۔ قادر مُطلق نے تو اپنی پسند اور ناپسند لوگوں پر واضح کر دی۔ تو اب جو شخص دنیا میں خدا کی رضا کے راستے پر چل کر اُسکی مرضی کو غالب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے اپنی مدد شمار کرتا ہے۔ بس جو شخص فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں اللہ کے رسول ﷺ کا ساتھ دیتا ہے اور اس راہ میں اپنی صلاحتیں‘ وقت اور مال خرچ کرتا ہے تو وہ اللہ کے رسول کی نصرت تو کر ہی رہا ہے مگر یہی اللہ کی نصرت بھی ہے۔

۴۔ اتّباعِ نُور یعنی قرآن مجید کی تعلیمات پر عمل

سورۃ الاعراف کی آیت 157 کے مطابق رسول کریم ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی چوتھی بنیاد قرآن مجید کا اتباع یعنی پیروی ہے۔ قرآن کو یہاں نور فرمایا گیا ہے یعنی اس روشنی سے

فائدہ اٹھایا جائے۔ اس کو غنیمت جان کر اس کو پڑھا جائے۔ سمجھا جائے اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اگرچہ اس آیت میں بیان کردہ پہلی تین باتوں۔ ایمان بالرسالت، نبی ﷺ اُمی کی عزت وتکریم اور نصرت وحمایت سے ہی بات واضح ہوگئی تھی مگر قرآن کی پیروی کو الگ کر کے بیان کیا گیا۔ وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو بہر حال اس فانی دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے۔ ایک مختصر مدت کے لئے آپ ﷺ کی صحبت صحابہ کرامؓ کو میسر رہی۔ مگر جس چیز کو ہمیشہ کے لئے رسول اللہ ﷺ کا قائم مقام بننا تھا وہ یہی قرآن مجید ہے۔ یہ اللہ کا وہ کلام ہے جو آپ ﷺ پر نازل ہوا اور یہ وہ نور ہے جو ہمیشہ روشنی پھیلاتا رہے گا۔ چنانچہ اسی حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر آخری وصیت کے طور پر ارشاد فرمایا۔ ((وَقَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِہٖ فَلَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا وَھُوَ کِتَابُ اللّٰہ)) صحیح مسلم ”اور میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں جس کو اگر تم مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو تم کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔ وہ چیز ہے اللہ کی کتاب، یعنی قرآن مجید۔

افراد امت کے ساتھ آپ کی یہ الوداعی گفتگو تھی جس کے آغاز میں آپ نے فرمایا ”اے لوگو! میری بات غور سے سنو۔ کیونکہ شاید اس سال کے بعد اس مقام پر میں تم سے دوبارہ نہ مل سکوں۔ اسی خطبے کے آخری حصے میں آپ ﷺ نے تاکید کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ ”قرآن پاک کو مضبوطی سے تھامے رکھنا اس کا دامن پکڑے رکھنا اور ہرگز یہ خیال نہ کرنا کہ میں تم کو بے یار و مددگار چھوڑ کر جا رہا ہوں، تمہاری ہدایت اور راہ نمائی کے لئے میں اپنے پیچھے اللہ کی کتاب چھوڑے جا رہا ہوں‘ اللہ کا نازل کردہ وہ نور چھوڑے جا رہا ہوں جو تمہیں کفر وشرک کے اندھیروں سے نکال کر توحید کی سیدھی راہ کی طرف لے جائے گا۔ اگر تم اس قرآن کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔

رسول اللہ ﷺ نے قرآن پاک کو حَبْلُ اللّٰہ یعنی اللہ کی رسی قرار دیا ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت علیؓ ہیں۔ اس طویل حدیث میں یہ الفاظ نہایت لائق توجہ ہیں کہ ”قرآن مجید وہ کتاب ہے جس سے علماء کبھی سیری محسوس نہ کریں گے۔ کثرت اور بار بار کی تلاوت سے

اس کتاب پر کبھی باسی پن طاری نہ ہوگا اور نہ ہی اس کے عجائبات کبھی ختم ہوں گے۔''

یہ حدیث دراصل قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح ہے۔ سورۃ الحج میں ارشاد ہے ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ﴾ یعنی اللہ کے ساتھ چمٹ جاؤ۔ اللہ کے دامن سے وابستہ ہوجاؤ۔ تو اللہ کے دامن سے کیسے جڑ جائیں؟ اس بات کو سورۂ آل عمران میں مزید کھولا گیا ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ﴾ یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی رسی سے کیا مراد ہے؟ حضرت علیؓ سے مروی حدیث جس کا ابھی حوالہ دیا گیا اس کے اندر یہ وضاحت موجود ہے کہ ((هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْن)) یعنی یہی قرآن اللہ کی مضبوط رسی ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پختہ کرنے کیلئے قرآن مجید کے ساتھ تعلق کو مضبوط کرنا بہت ضروری ہے اور یہی بات سورۃ الاعراف کی مذکورہ آیت نمبر **157** میں بیان کی گئی ہے۔

موجودہ صورت حال

رسول اللہ ﷺ کی زوردار نصیحت بلکہ وصیت تو یہ تھی کہ قرآن مجید کو مضبوطی سے تھامے رکھنا تاکہ گمراہ نہ جاؤ۔ مگر ہم اسی حبل اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو کمزور سے کمزور تر کرتے چلے گئے۔ صورت حال یہاں تک پہنچی کہ اس کی تلاوت محض حصول ثواب یا ایصال ثواب کے لئے رہ گئی۔ اسے ضابطہ حیات اور راہ نما سمجھنا صرف تقریر وتحریر کی حد تک رہ گیا۔ اس کے احکام پر عمل کا جذبہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ چونکہ آپ ﷺ نے بتا دیا تھا کہ اس قرآن کو تھامے رکھنا گمراہی سے بچائے گا تو اس کو چھوڑنے کا نتیجہ خود بخود گمراہی ہی کی صورت میں ہی نکلنا تھا۔ جو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ جب تک مسلمانوں نے قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط رکھا یعنی اس کی راہ نمائی میں زندگیاں گزارتے رہے انفرادی اور اجتماعی ہر سطح پر ان کا رعب و دبدبہ قائم رہا دنیا میں وہ سربلند و غالب رہے۔ لیکن جیسے جیسے وہ اللہ کی کتاب سے دور ہوتے چلے گئے ویسے ویسے اُن پر زوال کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے۔ ان کے عقائد خراب ہوگئے۔ اعمال بگڑ گئے۔ بدعات نے رواج پکڑا۔ خواہش نفس کی پیروی شروع ہوئی۔ اس صورت حال میں مسلمان سیسہ پلائی

دیوار تو کیا بنتے بے شمار فرقوں، قومی ونسلی اور لسانی وجغرافیائی گروہوں میں تقسیم ہوکر اپنی شان و شوکت اور عزت و وقار کھو بیٹھے۔ ہم اس بات کو کیوں بھول گئے کہ قرآن، خدا کا کلام لوگوں کے لئے ہدایت اور ضابطہ حیات ہے۔ یہ صرف حصول ثواب اور ایصال ثواب کے لئے نہیں بلکہ پڑھ کر سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کے لئے ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم

؎ وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہوکر

سورۃ الفرقان میں نبی اکرم ﷺ کی، اللہ کے حضور ایک دردمندانہ شکایت نقل کی گئی ہے۔

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًاO﴾

''اور رسول ﷺ نے کہا کہ اے میرے رب میری قوم نے اس قرآن کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔'' (نظر انداز کردیا گیا)۔

اگرچہ یہاں اصلاً تذکرہ اُن کفار کا ہے، جنہوں نے قرآن کو اللہ کا کلام اور وحی ربّانی تسلیم کرنے سے انکار کردیا تاہم قرآن کے وہ ماننے والے بھی اس ذیل میں آتے ہیں جنہوں نے قرآن پاک سے راہنمائی حاصل کرنے کے سلسلہ میں کوتاہی کی روش اختیار کررکھی ہے۔ اس کو غور سے پڑھنا، سمجھنے کی کوشش کرنا اور پھر اس کے مطابق زندگی بسر کرنا اُن کے پروگرام میں شامل ہی نہیں۔ حالانکہ حکم یہ تھا کہ قرآن سیکھو۔ اس پر عمل کرو اور اسے دوسروں تک پہنچاؤ۔ جب مسلمان خود ہی اس نور سے دور ہوچکے ہوں تو دوسروں کو اس کی دعوت کیا دیں گے۔

اصلاح حال کا واحد راستہ

یہاں پہنچ کر اگر اصلاح احوال کی خواہش پیدا ہو تو اس سلسلہ میں ایک جامع حدیث ملاحظہ ہو۔

يَا اَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ اٰنَاءِ اللَّيْلِ

وَالنَّهَارِ وَاَفْشُوهُ وَتَغَنَّوهُ وَتَدَبَّرُوا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (رواه البيهقى فى شعب الايمان)

''اے قرآن والو! قرآن کو بس اپنا تکیہ ہی نہ بنالو، بلکہ دن اور رات کے اوقات میں اس کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے اور اس کو (چہار دانگ عالم) میں پھیلاؤ، اور اس کو خوش الحانی سے حظ لیتے ہوئے پڑھا کرو، اور اس میں تدبر اور غور وفکر کیا کرو......تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

آیئے اس قول رسول ﷺ پر غور کریں۔ مسلمانوں کو اہل قرآن کے الفاظ سے خطاب فرما کر حضور ﷺ یہ احساس دلا رہے ہیں کہ مسلمانو! قرآن تمہارا ہے اس کو **OWN** کرو۔ اس کے ساتھ جڑ جاؤ۔ پھر متوقع خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا کہ قرآن کو تکیہ نہ بنالینا۔ تکیہ کے ساتھ ٹیک لگا کر آدمی سہولت محسوس کرتا ہے پس مطلب یہ ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ تم قرآن کو محض ایک سہارا بنالو۔ اُس کے ساتھ عقیدت کا اظہار کرکے، قیمتی جزدان پہنا کے، آنکھوں پر لگا کے پیشانی پر بوسہ دے کر، اونچی جگہ پر رکھ دو اور پھر کبھی کبھی حصولِ ثواب کے لئے محض تلاوت کر کے اپنے آپ کو مطمئن کرلو۔ یہ جھوٹا اطمینان ہے۔ ایسا نہ کرنا۔

پھر فرمایا ''دن اور رات کے اوقات میں قرآن کی تلاوت اس طرح کرو جس طرح تلاوت کرنے کا حق ہے۔'' یعنی تلاوت کے وقت عقیدت اور محبت بھی ہو اور سمجھنے اور عمل کرنے کا ارادہ بھی ہو۔ پھر اس کو پھیلاؤ۔ یعنی خود اپنے عمل میں اسے لاؤ گے تو دوسرے کے سامنے پیش کرسکو گے۔ اسے پڑھو خوش الحانی کے ساتھ۔ اسی کو قرآن مجید میں ''رتّل القرآن ترتیلا'' کہا گیا ہے۔ کیونکہ خوش الحانی کے ساتھ پڑھنا تب ہی ممکن ہے جب آدمی ٹھہر ٹھہر کر پڑھ رہا ہو؛ اور آخری بات یہ فرمائی کہ اس پر غور وفکر کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

پس ظاہر ہے کہ فوز وفلاح مطلوب ہو تو قرآن سے جڑنا پڑے گا۔ آخرت کا معاملہ تو ہے ہی، دنیا میں بھی مسلمانوں کا عروج وزوال قرآن کے ساتھ وابستہ ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ

سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَّ يَضَعُ بِهٖ اٰخَرِيْنَ﴾ یعنی ''اللہ اس کتاب عزیز کی وجہ سے کچھ قوموں کو عزت وسربلندی عطا فرمائے گا اور دوسروں کو (اس کتاب کے چھوڑنے کی وجہ سے) ذلت ورسوائی سے دوچار کرے گا۔''

آیات قرآنی اور فرامین رسول ﷺ کی روشنی میں تفصیلی طور پر یہ بات ہمارے سامنے آئی ہے کہ مسلمانوں کی پستی، گراوٹ اور زوال دراصل قرآن مجید سے دوری کا نتیجہ ہے۔ یہی بات امت کے بلند پایہ علمائے حق کہتے چلے آرہے ہیں۔

یہاں ایک بہت بڑے عالم دین کا قول نقل کیا جارہا ہے انہوں نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ''جہاں تک میں نے غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، اور دوسرا آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ لہٰذا میرے خیال میں اس صورت حال سے نکلنے کی واحد صورت یہ ہے کہ ایک جانب قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کیلئے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قائم کئے جائیں، بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے نیز قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے انہیں آمادہ کیا جائے اور دوسرا یہ کہ مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔''

چنانچہ جو لوگ صحیح معنوں میں پاکستان کے اندر حالات کی اصلاح چاہتے ہیں ان کی تمام تر توجہ اللہ کی کتاب کی خدمت میں لگ جانی چاہئے۔ قرآن مجید کو پڑھنے پڑھانے، سمجھنے سمجھانے، اس کی دعوت کو عام کرنے کو مقصد زندگی بنا کر مصروف عمل ہوجانا چاہئے۔ خلوص کے ساتھ کی گئی یہ کوشش کامیاب ہوگی جس کے نتیجہ میں جملہ مسائل حل ہوجائیں گے۔ ایمان ویقین پختہ ہوگا۔ عقائد درست ہوں گے۔ شرک وبدعت سے نفرت ہوگی۔ اخلاق وعمل میں اصلاح ہوگی اور ایسا معاشرہ قائم ہوگا جو اسلامی معاشرہ کہلانے کا مستحق ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ کے طریق کار کی پیروی میں ہی اسلامی نظام کا قیام ممکن ہے اور کسی طریقے سے نہیں۔

قرآن سیکھنے اور سکھانے کی اہمیت

یوں تو قرآن وحدیث میں قرآن سیکھنے اور سکھانے کے فضائل پر کافی مواد موجود ہے تاہم یہاں غور وفکر کی غرض سے تین احادیث درج کی جاتی ہیں۔

1- حضرت عثمانؓ راوی ہیں اور یہ حدیث صحیح بخاری کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں بھی موجود ہے۔

((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ))

تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن کا علم حاصل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں۔

2- دوسری حدیث کے راوی حضرت جبیر بن معطمؓ ہیں اور یہ طبرانی کبیر میں موجود ہے۔

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلَیْسَ تَشْهَدُوْنَ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّ الْقُرْاٰنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ؟ قُلْنَا بَلٰی قَالَ: فَاَبْشِرُوْا فَاِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ طَرَفُهٗ بِیَدِاللّٰهِ وَطَرَفُهٗ بِاَیْدِیْكُمْ فَتَمَسَّكُوْا بِهٖ فَاِنَّكُمْ لَنْ تَهْلِكُوْا وَلَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اَبَداً))

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ”کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے۔“ ہم نے عرض کیا یقیناً! تب آپ ﷺ نے فرمایا ”پس خوشیاں مناؤ اس لئے کہ اس قران کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور ایک (دوسرا) سرا تمہارے ہاتھ میں۔ پس اسے مضبوطی سے تھامے رکھو۔ (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم اس کے بعد نہ کبھی ہلاک ہوگے اور نہ گمراہ۔“

3- تیسری حدیث کے راوی حضرت ابوسعید الخدریؓ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : كِتَابُ اللّٰهِ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَی الْاَرْضِ))

رسول اللہ نے فرمایا اللہ کی کتاب ہی اللہ کی وہ رسی ہے جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے۔

خلاصہ کلام

اس ساری تفصیل سے یہ بات سامنے آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا اُمتی بننے کی پہلی شرط ایمان ویقین ہے اور دوسری عزت واحترام ہے جو دراصل پہلی شرط کا لازمی تقاضا ہے۔ عزت واحترام کا جذبہ ہوگا تو حقیقی محبت پیدا ہوگی جس سے اطاعت واتباع کی توفیق ملے گی۔ تیسری شرط نصرت ہے۔ یعنی جس کام میں حضور ﷺ زندگی بھر مصروف عمل رہے اُسی کو ہم اپنی زندگی کا مقصد بنالیں۔ جس طرح آپ نے اپنی زندگی میں جزیرہ نمائے عرب کی حدتک دین حق کو غالب کردیا ہم اس کام کو آگے بڑھائیں۔ یہاں تک کہ پورے کرہ ارض پر غلبہ دین کا مقصد پورا ہو۔ یہ کام امت کے ذمہ قرض ہے جس کی ادائیگی ہر اُس شخص پر فرض ہے جو آپ ﷺ کے دامن سے وابستہ ہے اور حضور ﷺ کا امتی کہلاتا ہے۔ اس ضمن میں چوتھی چیز جو سورۃ الاعراف کی آیت 157 میں بیان ہوئی وہ قرآن مجید کی پیروی ہے کیونکہ دین حق کے غلبہ کی طرف چلنے کے طریق کار کی راہنمائی اور اپنی زندگیوں کو صاف ستھرا بنانے کا طریقہ ہمیں اس سے حاصل ہوگا۔

ہمیں اس کتاب (قرآن) کو مضبوطی سے تھام کر دعوت اسلام کے مشن پر نکلنا ہوگا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کی تکمیل میں جدوجہد کر کے ہم دنیا وآخرت میں سرخرو ہوسکیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا اُمتی بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوانا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِینo

سچا اُمتی کون؟

ترتیب وتدوین

محمد یونس جنجوعہ

شائع کردہ

شعبہ نشرو اشاعت

تنظیم اسلامی پاکستان

مرکزی دفتر 67۔اے علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور۔

فون 6316638-6366638 فیکس 6305110

نام کتاب	سچا اُمتی کون؟
طبع اوّل	ستمبر 2003
ناشر	ناظم نشرواشاعت تنظیم اسلامی پاکستان
مطبع	
مقام اشاعت	مرکزی دفتر تنظیم اسلامی پاکستان
	67۔اے علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہولاہور
	فون نمبر 6316638-6366638